مغربی مفکرین کا فلسفہ تاریخ

Philosophy History of Western Thinkers

Dr. Sultan Shams ul Haq
Inspector Cooperative Society, Punjab.

Abstract

All the events of human civilization that have reached us have been reached through history. According to their interest, historians have recorded these events and passed them on to the next generation. There is not only one aspect to human cultural tradition, but any civilization has many aspects of human life. Human civilization is a combination of different spheres of life. And then all the events that have happened in human civilization can have one or more causes. The purpose of the philosophy of history is to find out what are the causes and causes of any event. Modern historians have presented their investigations keeping them in front. Hegel categorizes history and looks at it from different perspectives, insisting on describing history in a dialectical manner. Karl Marx sees history in terms of material utility, classes, and exploitation. Spangler divides civilization into different periods where civilizations begin in some way and then reach a point of rise and fall in some way. According to Tine B, the main point of civilization is not creativity. If creativity and creative minorities are present in society, they continue to respond to the challenges that arise. When they disappear, civilizations fall into decline. Will Duran sees history with human efforts and its intellectual evolution, the evolution that man has created in all aspects of his life, and the facilities he has created for himself while keeping the future in front, this environment speaks of his efforts. There is evidence. Carlyle is convinced of individualism, he says that the task of nations is not to create men and obey them, and history is associated with great men. Christine Klepser says that man was not alone in the entire human struggle, woman has been there with him at every opportunity, she has supported him, and why women are forgotten in history.

Keyword: History, Philosophy of history, civilization, Historians, cultural, tradition,

موضوع تحقیق کا تعارف اہمیت اور پس منظر

فلسفہ تاریخ حقیقت میں فکر اور اسلوبِ گفتار ہے۔ تاریخ کے معمے حل کرنے اور نتائج تک پہنچنے کے لیے حکیمانہ منشور اور اصول ہے۔ جب فلسفہ تاریخ کی بات کی جاتی ہے تو اس کا مطلب تاریخ کے کسی دور کا گہرا مطالعہ اور وسیع غور و فکر ہے جس سے اس دور کے حقائق اور نتائج سامنے آتے ہیں۔ یہ نتائج اور حقائق خاص قدر و قیمت رکھتے ہیں۔ مؤرخ ان نتائج اور حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے اس تاریخی پس منظر کو پیش منظر کے آئینہ میں دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔

ڈاکٹر صادق علی گل تاریخ اور فلسفہ تاریخ کی تشریح اس طرح کرتے ہیں۔ ''علم تاریخ کا کام یہ دیکھنا ہے کہ ہم کس طرح سوچتے ہیں؟ جبکہ فلسفہ کا کام یہ دیکھنا ہے کہ کس طرح سوچنا چاہیے یا ہماری فکر اور استدلال کو کیسا ہونا چاہیے؟''[1] کسی بھی دور کے حالات و واقعات اس دور کے محرک فکر کی عکاسی کرتے ہیں ہر چیز کے دو پہلو ہوتے ہیں ہر واقعہ کی بنیاد اسباب اور علل پر ہوتی ہے جس طرح فعل اور خیال لازم و ملزوم ہیں۔ اسی لیے جب مؤرخین نے واقعات کو لکھنا شروع کیا تو ان کی تشریح و توضیح کے ساتھ ساتھ ان واقعات کا تجزیہ بھی کیا۔

مغرب میں جدید دور کے فلسفہ تاریخ کا تصور سب سے پہلے والٹیر[2] (۱۶۹۴۔۱۷۷۸ء) نے پیش کیا[3] اس کا مقصد یہ تھا کہ مورخ محض واقعات کو ہی بیان نہ کرے بلکہ ان پر غور و فکر بھی کرے ان کا تجزیہ کر کے ان سے کوئی نتیجہ بر آمد کرے۔ مؤرخ ماضی کو مردہ نہیں سمجھتا بلکہ وہ ماضی کے واقعات سے روح مسلسل کو ڈھونڈتا ہے۔ واقعات مر جاتے ہیں لیکن ان کی روح آنے والے واقعات میں منتقل ہوتی رہتی ہے۔ جب تک مؤرخ واقعات کی روح سے واقف نہ ہو گا تو وہ ماضی سے بے بہرہ رہے گا۔ وہ انہی واقعات کی تشریح اور توضیح کر کے حیاتِ انسانی کی ایک بامعنی تصویر کھینچتا ہے۔

فلسفہ تاریخ کا تعلق تاریخ کی حقیقی نوعیت اور علم تاریخ کی معنوی قدروں سے ہے۔ یہ دراصل تاریخی مواد کا فکری نچوڑ ہے۔ وسیع تر معنوں میں فلسفہ تاریخ میں عقائد اور نظریات دونوں شامل ہیں غور کرنے سے معلوم ہو گا کہ عقائد اور نظریات ظاہر حقیقتوں سے ماورا ہوتے ہیں یہ کسی زمانہ کی اجتماعی زندگی کے امتزاج کا حاصل ہوتے

---

1 ڈاکٹر صادق علی گل، فن تاریخ نویسی (لاہور: پبلشر زایمپوریم، ۲۰۰۲ء)، ص ۳۴۴۔

2 والٹیر نشاۃ ثانیہ کا مشہور فرانسیسی فلسفی اور مؤرخ تھا۔ وہ مذہبی، لسانی اور ریاستی آزادی کا حامی تھا۔ اس نے دو ہزار سے زائد کتب اور رسالے لکھے۔

3 R.G. Collingwood, *The Idea of History* (London: Oxford,1966), P 115-116.

ہیں یہ منتشر اعمال کا مجموعہ نہیں بلکہ ان اعمال کا کوئی مقصد ہوتا ہے جس کے لیے یہ ظہور میں آتے ہیں اور یہی وہ نقطہ ہے جہاں سے کسی عمل کے مقصد کا پتہ چلتا ہے۔

Thus, ideas are the main theme of the study of history. Ideas are not an invariable stock that does not change. Every idea originated at a definite point of time and space in the head of the individual.[4]

تاریخ کا مطالعہ اصل میں نظریات کا مطالعہ ہے اور نظریات کبھی ایک جیسے نہیں ہوتے ہر نظریہ ایک نئی ایجاد کی مانند ہے جو دنیا کے تمدن میں اضافہ کرتا ہے۔ ہر تاریخ پس منظر میں ایک جداگانہ نظریہ ہوتا ہے جو دوسروں سے بلکل مختلف ہوتا ہے۔ اس لیے جب تک مؤرخ کو افکار اور نظریات کا صحیح اندازہ نہیں ہو گا اس وقت تک وہ اس ماحول اور انداز فکر کو سمجھا نہیں سکتا۔

History carries the mark of the singular-factual Nature that of the continuously possible[5].

لہذا فلسفہ تاریخ واقعات کے پیچھے کار فرما عوامل کو حال کے تناظر میں مطالعہ کرنے اور پھر ان سے مستقبل کی تعبیر کی جاتی ہے۔

History is not a series of events, but a system of things known.[6]

فلسفہ تاریخ کو سامنے رکھتے ہوئے جدید فلسفہ تاریخ سے صرف ان سکالرز کو منتخب کرتے ہیں۔ جنہوں نے تاریخ، فلسفہ تاریخ میں نمایاں تحقیقات پیش کیں۔

ہیگل کا نظریہ تاریخ

تاریخ نویسی کے لحاظ سے ہیگل[7](Georg Wilhelm Friedrich Hegel:-1770-1831) نے تاریخ کو تین قسموں میں بیان کیا۔

---

4 Ludwig Von Misses, *Theory and History* (London: Oxford,1985), 225.

5 Spengler, *The Decline West* (London: George Allen), p158.

6 R.G. Collingwood, *The Idea of History*, p3.

7 جارج ولیم فریڈرک ہیگل جرمنی میں سٹوٹ گارٹ میں پیدا ہوا ابتدائی تعلیم اپنے قصبے میں ہی حاصل کی اور اعلیٰ تعلیم کے لیے بیرن سے حاصل کی۔ تعلیم سے فارغ ہو کر وہاں ہی تدریس شروع کر دی۔ اس نے گوئٹے، کانٹ اور شیلنگ کے نظریات کا خصوصی مطالعہ کیا۔ ہیگل کے مضامین نے اسے کافی شہرت دی اسی وجہ سے اسے ہائیڈل برگ یونیورسٹی میں جگہ مل گئی اس نے اپنے شاگردوں میں نئی روح پھونکی اس نے درس و تدریس کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کا کام بھی جاری رکھا۔ ۱۸۱۶۔ ۱۸۳۰ء ہیگل کا انتہائی عروج کا زمانہ تھا وہ اپنے ہم عصر مفکرین پر تنقید کرتا۔ آخر ۱۸۳۱ء ہیگل برلن ہی میں وفات پا گیا۔

(Terry Pinkard, *Hegel A Biography* (UK: Cambridge University Press,2000), p:45)

۱۔ حقیقی تاریخ۔(Original History)

۲۔ عکسی تاریخ۔(Reflective History)

۳۔ فلسفیانہ تاریخ(Philosophical History)

حقیقی تاریخ(Original History)

حقیقی تاریخ میں مؤرخ گرد و پیش کے واقعات و حالات اور معاشرتی خدوخال کو بعینہ سپردِ قلم کرتا ہے ۔مؤرخ کے دور میں ہونے والے واقعات جن کو وہ قلم بند کر رہا ہوتا ہے وہ ان کا عینی شاہد ہوتا ہے اس کے علاوہ اپنے دور کے ان افراد پر بھی وہ اعتماد کرتا ہے جنہوں نے ان واقعات کو بنفس نفیس دیکھا ہوتا ہے اس لئے ان واقعات کو بھی مستند خیال کیا جاتا ہے۔ حقیقی تاریخ میں اس دور کے رسم و رواج اور قصہ کہانیوں کو بھی شامل کیا جاتا ہے۔ یہ باتیں تاریخ کے لیے خام مال کی طرح ہوتی ہیں اور یہ تاریخی قیاس میں اتنی اہم نہیں ہوتیں، ان کا تعلق ذہنی طور پر پس ماندہ قوموں سے ہوتا ہے۔ مؤرخ اس عہد کے معاشرتی حالات وواقعات اور کیفیات کو جمع کر کے ایک نظریاتی قوت مہیا کرتے ہیں اس لیے یہ تاریخ مستند جامع اور مفید ہوتی ہے۔ حقیقی تاریخ میں مؤرخ حقیقت نگاری اور راست روی سے کام لیتا ہے۔ وہ واقعات کو دلچسپ بنانے کے لئے رسم و رواج کو دلکش اور قصے کہانیوں کو زیب داستان کے لیے قلم بند کر کے حقائق سے منہ نہیں موڑتا بلکہ وہ اپنی ذاتی پسند اور روح کو واقعاتی روح میں سمو دیتا ہے اور یہ دونوں یک جا ہو کر واقعات کو قابل اعتبار بنا دیتے ہیں۔ حقیقی تاریخ میں مؤرخ خود شریک رہا ہوتا ہے اور واقعات بھی مختصر دور کا احاطہ کرتے ہیں۔ مؤرخ اپنے سامنے ہونے والے واقعات کی بہت ہی جامع اور واضع تصویر پیش کرتا ہے۔ حقیقی تاریخ کے مؤرخ کا سب سے بڑا مقصد یہی ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کے سامنے وہ تصور پیش کرے جو ٹھیک ٹھیک اس کے ذاتی مشاہدے کی بنا پر مرتب ہو۔ اس طرح حقیقی تاریخی واقعات حقیقی زندگی کی تصویر پیش کرتے ہیں ۔وہ غیر اہم، غیر فطری اور غیر حقیقی واقعات کو قلم بند کرنے سے گریز کرتا ہے۔ ہیگل مثال کے طور پر ایسے مؤرخین کو پیش بھی کرتا ہے جنہوں نے مستند اور ثقہ واقعات کو جمع کیا غیر حقیقی واقعات سے گریز کیا، ان میں ہیرو ڈٹس، تھنکے اور ڈائڈز وغیرہ ہیں۔[8]

عکسی تاریخ۔(Reflective History)

ہیگل کے ہاں عکسی تاریخ تین طرح کی ہے۔(ا)۔ عالمی عکسی تاریخ(ب)۔ سبق آموز تاریخ(ج)۔ تنقیدی تاریخ

---

8 Georg Wilhelm Friedrich, Hegel, *The Philosophy of History* (Canada: BatocheBooks,2001), p14-17.

عالمی عکسی تاریخ

عالمی تاریخ میں عہدِ حاضر کی روح کار فرما ہوتی ہے۔ ہر تاریخ اپنے اپنے دور کی عکاسی کرتی ہے جب اس کو اس دور سے الگ کر کے جامع شکل میں پیش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو اس میں اس عہد کی روح کو قائم رکھنا مشکل ہوتا ہے۔ مؤرخ کا تعلق عہد حاضر سے ہوتا ہے جب وہ ماضی کی تاریخ کو قلم بند کرنے کی کوشش کرتا ہے تو ماضی کی روح کم ہو کر عہد حاضر کی روح غالب ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ ماضی کی تاریخ کا اس عہد کے حوالے سے مطالعہ کیا جاتا ہے۔ عالمی عکسی تاریخ کا مؤرخ واقعات کو اسلوبِ جدید کا رنگ دے کر قاری کے لیے سہل اور قابل فہم تو بنا دیتا ہے لیکن تحقیق کی دنیا میں جو مقام ہم عصر مؤرخ کو ہوتا ہے وہ اس مؤرخ کو نہیں ہوتا اس طرح حقیقی تاریخ عالمی تاریخ سے زیادہ مستند ہوتی ہے۔ عالمی تاریخ کا تعلق لمبے عرصے سے ہوتا ہے۔ اس لئے وہ عہدِ ماضی کی حقیقی تصویر پیش کرنے سے قاصر رہتی ہے۔ حالات اور واقعات اپنے وقتی ماحول سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے ہمیں اپنے ماحول کے تناظر میں سمجھنے میں رکاوٹ پیش آتی ہے۔

سبق آموز تاریخ

تاریخ سے سبق آموزی اور اخلاق سازی کا کام بھی لیا جاتا ہے۔ مؤرخ ماضی سے سبق آموز واقعات کو تلاش کرتا ہے جو کسی ایک ہی موضوع سے تعلق رکھتے ہوں اور ان کو ترتیب دے کر اپنے مطلوبہ مقاصد کو حاصل کرتا ہے۔ سبق آموز تاریخ میں جدید عصری تقاضوں کو سامنے رکھ کر نصیحت انگیزی کا کام لیا جاتا ہے۔ ماضی سے سبق لیے کر مستقبل کے لیے راہیں متعین کی جاسکتی ہیں۔ جو اں ہمت لوگ مستقبل کے لیے خود اپنی راہیں متعین کرتے ہیں وہ تاریخی واقعات کی کوئی پروا نہیں کرتے۔ ہیگل کے نزدیک وقت کے ساتھ ساتھ اس کے تقاضے بھی بدلتے جاتے ہیں، اس لیے ضروری نہیں ہے کہ جو اصول وضوابط ماضی کے لیے کار گر ہوں وہ آج کے ماحول میں بھی اسی طرح اہمیت رکھتے ہوں۔ مقصدیت نگاری مؤرخ کو اپنے رتبہ سے گرا دیتی ہے۔ اسطرح کی تاریخ آہستہ آہستہ اپنا مقام بھی کھو دیتی ہے اور مؤرخ کی شخصیت کو بھی مسخ کر دیتی ہے۔

تنقیدی تاریخ

تنقیدی تاریخ عالمی تاریخ کا تنقیدی جائزہ ہوتا ہے۔ تنقیدی تاریخ نگار مؤرخ نہیں بلکہ ناقد کا درجہ رکھتا ہے۔ مؤرخ ناقد بھی ہوتا ہے کیونکہ وہ تاریخی ماخذ کا تنقیدی جائزہ لے کر تاریخ کو مرتب کرتا ہے مگر تنقیدی تاریخ

نگاری میں واقعات کا تنقیدی جائزہ لیا جاتا ہے اس طرح مواد کے حصول اور مواد کی ترتیب میں تنقید جاری رہتی ہے۔ اور یہ عمل تاریخ کی تاریخ کہلاتا ہے۔[9]

فلسفیانہ تاریخ(Philosophical History)

ہیگل ہر دور کی تاریخ کی تعبیر ایک نئے تصور کے ساتھ کرواتا ہے ہر دور دوسرے سے عقل و فکر کی وجہ سے ممیز ہوتا ہے۔ ہر انقلاب کے پیچھے عقلی اور فکری نظریات ہوتے ہیں اس لیے تاریخ نویسی کے لیے کسی دور کی عقلی اور فکری ترقی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ سکندر اعظم کی شان دار فتوحات کے پیچھے ارسطو کے عقلی و فکری نظریات کار فرما تھے۔ فلسفیانہ تاریخ میں کسی عہد کی تاریخ میں فکری پہلوؤں کی تلاش ہے۔ یہی فکری پہلو ایک دور کو دوسرے دور سے ممتاز کرتے ہیں اور انسان کو حیوان سے ممیز کرتے ہیں۔ تاریخ کا کام رونما ہونے والے واقعات کو بعینہ قلم بند کرنا ہے مگر فلسفیانہ تاریخ میں مؤرخ علت اور معلول کے تحت فلسفیانہ عناصر کو تلاش کرے گا۔ یعنی جو ہو چکا ہے یا ہو رہا ہے اس میں وجوہات کا اضافہ کر کے ماضی کے واقعات کا ایک مدلل مجموعہ پیش کرے گا۔ دلیل جو کہ کائنات کی ایک بہت بڑی قوت ہے اس کو نظر انداز کر کے تاریخ نویسی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

دلیل کے بغیر تاریخ ایک بے ربط اور خشک مضمون رہ جائے گا اور پھر مطالعہ تاریخ میں دلچسپی بلکل ختم ہو جائے گی۔ تاریخ میں ایسے واقعات بھی آتے ہیں جو محیّر العقول ہوتے ہیں اگر ان کی فلسفیانہ تشریح نہ کی جائے تو قاری پوری تاریخ کو جھوٹ قرار دے دے گا۔ اس لیے مؤرخ کا کام ہے کہ وہ واقعات کو دلیل کی کسوٹی پر پرکھ کر اور مناسب تشریح کر کے ان کو پیش کرے۔ اہرام مصر حیران و پریشان کر دیتے ہیں اور مؤرخین ان کو کسی دوسری مخلوق کا کارنامہ قرار دیتے ہیں (جنوں یا دیوؤں)۔ اب یہ مؤرخ کا کام ہے کہ وہ اس وقت کے فن تعمیر اور اس وقت کے فراعنہ مصر کے کمال فن کی تشریح و توضیح کرے کہ سب کچھ کیسے ممکن ہوا۔ ہیگل کہتا ہے اگر مؤرخ دیانتداری اور سوچ بچار کو بھی تاریخ نویسی میں بروئے کار لائے تو یہ تاریخ کو مزید زیادہ سنوار دے گا۔ عقل و فہم کے ساتھ تاریخی واقعات کا مطالعہ کرنا تاریخی حقائق و واقعات کے عقلی پہلو کو منعکس کرتا ہے۔ اس لیے مؤرخ کو تاریخی مواد کے انتخاب میں عقل و بصیرت سے بھی کام لینا چاہیے۔

جدلیت(Dialecticism)

ہیگل کے مطابق دنیا جامد نہیں بلکہ متحرک اور ارتقاء پذیر ہے۔ یہاں ہر چیز شکست و ریخت کا شکار ہو کر پہلے منتشر ہوتی ہے اور پھر متحد ہو کر ترقی پاتی ہے۔ عمل ارتقاء میں ادنیٰ حالت اعلیٰ کی طرف سفر کر کے محفوظ ہو جاتی

9 Hegel, *The Philosophy of History*, p17-24

پھر یہ مزید ارتقائی منازل کے لیے تیار ہوتی ہے اس تمام عمل کو ہیگل نے جدلیاتی عمل کا نام دیا ہے۔ ہیگل کے مطابق تاریخ میں موجود متضاد قوتیں تاریخ کے لیے ایک متحرک کا کام دیتی ہیں اور یہ تبدیلی اس کی نشان دہی کرتی ہے۔ یہ دنیا مسلسل تبدیلی کا شکار رہی ہے۔ ہیگل اس عمل کی تشریح یوں کرتا ہے کہ "مجرد تصور سے آغاز ہوتا ہے جسے دعویٰ کہتے ہیں۔ یہ تصور ایک ضد کو جنم دیتا ہے جسے ضد دعویٰ کہتے ہیں(Thesis- AntiThesis)۔ یہ دونوں تصور مل کر ایک تیسرے تصور کو جنم دیتے ہیں جو ان دونوں کا امتزاج ہوتا ہے۔(Synthesis)اس عمل میں ایک شے ابطال کرتی ہے پھر اس ابطال کا اعلیٰ شکل میں ظہور ہوتا ہے۔[10] انڈے سے چوزہ بننے تک عمل جدلیاتی عمل کی مثال ہے۔ انڈے کا جرثومہ (Thesis) جو نشو نما پا کر انڈے کے اجزاء کا ابطال(Anti Thesis) کرتا ہے ان دونوں کے امتزاج(Synthesis) سے جوزا جنم لیتا ہے۔ ہیگل اپنے اس جدلیاتی نظریے کا اطلاق معاشرے کے تمام اداروں پر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ مثلاوہ فن کو دعویٰ مذہب کو ضد دعویٰ اور فلسفہ کو امتزاج قرار دیتا ہے۔

ہیگل کہتا ہے کہ ہر دعویٰ کی حدود مقرر ہیں جب وہ اپنی ان حدود سے آگے بڑھتا ہے تو خود اپنی ضد پیدا کر لیتا ہے۔ مثلاماں اور بچے کی محبت فطری ہے جب یہ حد سے بڑھتی ہے تو بچے کو بگاڑ دیتی ہے۔ ماں بچے کو بگاڑ سے بچانے کے لیے اپنی محبت محدود کر لیتی ہے۔ یعنی حد سے بڑھتی ہوئی محبت کے نتیجہ میں بگاڑ نے ماں کے دل میں ایک نیا تصور پیدا کر دیا اور یہ نیا تصور محبت کی ضد ہے۔ لہذا اس سے ہیگل یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ ہر تصور اپنے مقابل یا ضد کو خود پیدا کر لیتا ہے۔ یہ نیا تصور پہلے کی جگہ لے لیتا ہے تو پہلے کی نفی ہو جاتی ہے۔ حد سے زیادہ منفی اثرات نے اس کو خود بخود تحلیل کر دیا، یہاں محبت دبی ضرور ہے مگر ناپید یا مکمل ختم نہیں ہوئی۔ اس طرح وہ یہ ثابت کرتا ہے کہ ہر نیا تصور پہلے تصور کی مکمل نفی نہیں کرتا بلکہ صرف ناقص پہلوؤں کی نفی کرتا ہے نئے اور پہلے تصور میں ایک ہی رشتہ ہوتا ہے جس سے ایک نئی وحدت معرض وجود میں آتی ہے پھر یہی نئی وحدت(Synthesis) پھر اسی عمل کو دوہرائے گی اور یہ عمل اسی طرح جاری رہے گا۔[11]

ہیگل اپنے اس نظریہ کو تاریخ پر یوں آزماتا ہے کہ ہر نظام ایک مخالف نظام پیدا کرتا ہے اور پھر ان کے ملنے سے ایک تیسرا نظام پیدا ہوتا ہے۔ مثلایونان نے اپنا مخالف روم پیدا کیا اور پھر اس دعویٰ کے خلاف یعنی امتزاج کے طور پر عیسائیت کا غلبہ پیدا کیا۔ بنوامیہ نے اپنے مخالف بنوعباس پیدا کیے۔ اسطرح دعویٰ ضد دعویٰ اور امتزاج تاریخ میں ملتا ہے اور تاریخ میں تغیر اور تبدیلی اسی جذبے کے تحت ہوتی ہے۔ اسی طرح ناتمام تہذیب سے ایک نئی تہذیب ابھرتی ہے جو پہلی کی ضد ہوتی ہے ان دونوں کے تصادم سے ایک نئی تہذیب وجود میں آتی ہے۔ اس تصادم

---

10 Michael Allen, *The Accessible Hegel Fox* (Prometheus Books, 2005), p:43.

11 A. V. Miller, *Hegel's preface to the Phenomenology of Spirit*, trans (Oxford: Clarendon Press, 1977), p: 29-30.

اور کش مکش کا سلسلہ جاری رہتا ہے جس سے نئی شکلیں بنتی اور ختم ہوتی رہیں گی۔ یہ سلسلہ اسوقت تک جاری رہے گا جب تک کوئی آخری اور مکمل تہذیب قائم نہ ہو جائے۔

کارل مارکس کا نظریہ تاریخ

کارل مارکس[12](Karl Marx: 1818-1883) کو تاریخ ساز حیثیت حاصل ہے۔ اس نے تاریخ کی نئے انداز سے تشریح کی، یہاں ہم کارل مارکس کے "تاریخ کے مادی نظریہ" کی وضاحت کریں گے۔

مادی نظریہ تاریخ

مارکس کا خیال ہے کہ قبائلی معاشرے کے اختتام سے ہی طبقاتی کش مکش کی ابتداء ہو گئی تھی اور یہی کشمکش اس کی ترقی کا باعث بنی۔ پیداوار کے اقتصادی نظام نے افراد کو دو بڑے طبقات میں تقسیم کر دیا۔ ایک مراعات یافتہ طبقہ اور دوسرا غیر مراعات یافتہ طبقہ یعنی استحصال کرنے والا اور استحصال کیا گیا۔ یہ دونوں طبقے ہر دور میں باقی رہے اور مدِ مقابل بھی رہے۔ اس کشمکش کے نتیجہ میں ایک دور سے دوسرا دور جنم لیتا رہا۔ مارکس ان ادوار کی وضاحت کرتے ہوئے کہتا ہے کہ پہلا دور غیر طبقاتی تھا۔ تمام ذرائع پیدائش لوگوں کے تصرف میں تھے۔ مگر ایک وقت آیا جب ایک علاقے کے رہنے والے لوگوں نے دوسرے علاقے پر قبضہ کر لیا اور وہاں کے لوگوں کو اپنا غلام بنا لیا۔ تو اسطرح تاریخ کا پہلا غیر طبقاتی دور اپنے اختتام کو پہنچا اور یہاں سے "غلامی کا دور" یعنی دوسرا دور شروع ہوا۔ یہ دور غلامی کا دور تھا اس دور میں ذرائع کے ساتھ ساتھ غلاموں کو بھی ملکیت تصور کیا جاتا تھا۔ غلام دن بھر محنت

---

12 کارل مارکس جرمن ریاست پرشیا کے صوبے رائن لینڈ کے قصبے ٹرائر میں پیدا ہوا۔ مارکس نے ابتدائی تعلیم اپنے آبائی قصبہ میں حاصل کی اور وہاں سے گریجویشن کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے بون یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ وہاں پرشیا کے شاہی خاندان کی لڑکی جینی سے معاشقے اور پڑھائی میں عدم توجہ کی وجہ سے والد نے بون سے برلن یونیورسٹی میں داخل کروا دیا۔ مارکس کا والد وکیل تھا اور وہ یہی چاہتا تھا کہ یہ بھی لاء کی ڈگری حاصل کرے مگر مارکس کی دلچسپی فلسفہ میں تھی اس نے ہیگل کے فلسفہ کا گہرا مطالعہ کیا۔ ۱۸۴۱ء میں جینا یونیورسٹی سے مارکس نے "فلسفہ جمہوریت اور اپی کیوریس" پر مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ اس کی انقلابی تحریروں کی وجہ سے اسے کالج میں تو ملازمت نہ ملی وہ صحافی بن گیا۔ جب اسے پرشیا سے جلاوطن کیا گیا تو وہ فرانس چلا گیا وہاں اسے فرانسیسی انقلابیوں کی تحریروں کا مطالعہ کرنے کا موقعہ ملا ۱۸۴۴ء میں اس کی ملاقات ڈاکٹر فریڈرک اینجلز سے ہوئی جو کہ پہلے ہی اشتراکی فکر کے حامل تھے۔ نظریات کی ہم آہنگی کی وجہ سے دونوں نے سرمایہ داری نظام کا خاتمہ کرنے کا عزم مصمم کر لیا اور ساری عمر اس مساعی میں صرف کر دی۔ ۱۸۴۹ء میں کارل مارکس انگلستان پہنچا اور تادم آخر وہیں رہا۔

(Max Beer, *The life and the teaching of Karl Marx* (Canada: Routledge,2011), p: 1-15)

مشقت کرتے تھے اوران کی آمدن مالک کو ہوتی تھی اور خود ان کو پیٹ بھر کر کھانا بھی نہیں ملتا تھا۔ان کو جانوروں کی طرح سمجھا جاتا تھاوہ اپنے آقا کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

دوسرا طبقہ عیش وآرام کی زندگی بسر کر رہا تھا۔اب ایک تیسرا دور آیا جب آقا اور غلام آپس میں بر سرپیکار ہوئے غلام فتح مند ہوئے اب یہ تاریخ کا تیسرا دور تھا،یہ دور جاگیر داری کا دور تھا۔اس دور میں غلام زمینوں کے مالک اور کسان بن گئے۔جاگیر داروں نے بھی کسانوں سے وہی سلوک کیا جو ماضی میں آقاؤں نے اپنے غلاموں سے کیا تھا۔یہ دور پہلے دور سے ترقی یافتہ ہے کیونکہ دوسرے دور کے غلاموں کی اپنی کوئی ملکیت نہیں تھی۔اب وہ محنت کر کے دولت کا کچھ حصہ اپنے پاس بھی رکھ سکتے تھے۔کچھ عرصہ کے بعد کسان اور جاگیر دار آپس میں بر سر پیکار ہو گے۔امیر طبقہ ہمیشہ اقلیت میں رہا ہے کسانوں کی اکثریت نے جاگیر دار طبقہ پر فتح حاصل کر لی۔ان دونوں طبقوں کے کش مکش اور تصادم سے ایک نئے دور کا آغاز ہوا جس کو سرمایہ داری کا دور کہا جاتا ہے۔تاریخ کا چوتھا دور سرمایہ داری کا دور ہے صنعتی انقلاب نے مصنوعات کو ترقی دی۔اس طرح سرمایہ دار اور مزدور کے دو طبقے وجود میں آئے۔اس دور کا مزدور کسانوں سے بہتر تھا کسان زمین بدل نہیں سکتا تھا جبکہ مزدور بہتر اجرت کے حصول کے لیے جگہ تبدیل کر سکتا تھا۔اس میں شک نہیں کہ سرمایہ دار طبقہ مزدور کو دبانے کی فکر میں تھا تاہم یہ دور تاریخ کے تیسرے دور سے بہتر تھا مارکس کے پیش نظر یہ دور تھا۔مارکس کے خیال کے مطابق آجیر کی سخت محنت کے باوجود آجر اس کی اجرت ادا نہیں کرتا۔آجر قدرِ زائد پر قبضہ کیے ہوئے ہے اور مزدور کا استحصال کر رہا ہے۔

قدر زائد

قدرِ زائد سرمایہ دار کے پاس جمع نہ ہوتی تو مزدور اس سے کئی گناہ خوشحال ہوتا۔اب مارکس مزدوروں اور سرمایہ داروں کے تصادم کا ذکر کرتا کہ پانچواں مزدور کی فتح اور سرمایہ دار کی شکست کا دور ہو گا اسطرح تاریخ اپنے پرولتاری آمریت کے دور میں داخل ہو جائے گی۔یہاں مارکس خیالی تصورات کو سامنے رکھتے ہوئے دلائل پیش کرتا ہے۔تمام ذرائع پیداوار زمین،کارخانے اور صنعتیں سلطنت یعنی اجتماعی نگرانی میں چلی جائیں گی۔ریاست کا یہ دور انقلابی اور عارضی ہو گا۔[13]

مارکس معاشی مسائل،اشیا کی پیدائش، تقسیم اور صرف سے متعلق اہم ذرائع کو تاریخ کے بدلنے کا ذریعہ سمجھتا ہے۔یہ ذرائع تاریخ کی سمت کا تعین کرتے ہیں۔ہر چیز کی پیداوار میں دو چیزیں شامل ہوتیں ہیں ایک خام مال اور دوسری انسانی محنت،خام مال قدرتی عطیہ اور مفت مہیا ہوتا ہے۔اس طرح ہر چیز کی پیداوار میں صرف انسانی

13 G.V. Plekhanov, *The Materialistic Conception of History* (Moscow, 1946), p:45-46.

محنت ہی باقی رہتی ہے۔ اس چیز کی قیمت دراصل انسانی محنت کی قیمت ہوتی ہے۔ جباس کو بطور معاوضہ حاصل کیا جائے تو اس میں نفع کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ سرمایہ دار نفع کی گنجائش نکالتا ہے اور یہی گنجائش چیز کی اصل قیمت ہے۔ "چیز کی اصل قیمت۔ مزدور کا معاوضہ۔ نفع" قدرِ زائد (Surplus Value) ہے۔ یہ قدرِ زائد مزدور کا استحصال اور سرمایہ داری کا ذریعہ ہے۔

مارکس کے مطابق وہ تمام عوامل غیر اہم اور غیر ضروری ہیں جو محنت کے علاوہ ہوں۔ محنت بھی تجارتی مال کی طرح بکاؤ جنس بن گئی ہے اس لیے کہ اسکی اجرت متعین ہونے لگی ہے۔ مزدور کی محنت اس کی زندگی کے جملہ لوازمات: رہائش، خوارک، لباس اور صحت وغیرہ کے برابر ہو یعنی اس کی محنت کو زندگی کی آشائشوں کی کفالت کرنی چاہیے۔ جبکہ ایسا نہیں ہو رہا مزدور محنت کیے جارہا ہے جو اس کے اختیار میں ہے اور پیداوار کے تمام ذرائع پر سرمایہ دار کا کنٹرول ہے۔ زمین، خام مال، زر، مشینری، سب اس کے قبضہ میں ہیں صرف محنت مزدور کے اختیار میں ہے جو بیچنے پر مجبور ہے۔ سرمایہ دار مزدور کی مجبوری سے پورا پورا فائدہ اٹھاتا ہے۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اگر مزدور محنت نہیں بیچے گا تو اسے ضائع کر دے گا وہ محنت کو ذخیرہ نہیں کر سکتا وہ محنت کا سودا نہیں کرے گا تو وہ فاقہ کشی کا شکار ہو جائے گا اس لیے وہ اپنی محنت کی منہ بولی قیمت وصول نہیں کر سکتا اس طرح مجبور ہو کر وہ اپنی محنت سستے داموں بیچنے کو تیار ہو جائے گا۔ اسطرح سرمایہ دار محنت کش کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اتنی کم قیمت لگائے گا جس سے صرف اس کا جسم اور روح کا رشتہ قائم رہے اور وہ مسلسل اپنی محنت بیچتا رہے۔ اس طرح سرمایہ دار محنت تو کم سے کم دآموں میں خریدتا ہے اور اپنی مصنوعات کو گراں داموں میں بیچنے کے لئے منڈیوں کی تلاش میں رہتا ہے۔ مارکس کے مطابق جنس کی قدر صرف محنت ہے اور چیز کی ساری قیمت مزدور کو ملنی چاہیے۔ تاہم عملی طور پر ایسا نہیں ہو رہا سرمایہ دار محنت کش کو معمولی حصہ دیتا ہے اور خود محنت کش کی پیدا کردہ قدر کو لوٹ لیتا ہے۔

مارکس کے مطابق یہ قدر ہی اصل میں صنعت ہے اور اس قدر کا اصل مالک مزدور ہے جسے بہت کم معاوضہ پر راضی کر لیا گیا ہے۔ اس معاشرتی طبقوں میں ایک سرمایہ دار اور دوسرا مزدور، پہلا طبقہ مسلسل دوسرے کا استحصال کر رہا ہے۔ اس طرح معاشرے میں طبقاتی کش مکش کا آغاز ہو گا اور یہ انتہائی صورت اختیار کرے گی۔ جب مزدوروں کا اتحاد بڑھے گا تو وہ منظم ہو کر عملی جدوجہد کریں گے تو محنت کشوں کی فتح یقینی ہو جائے گی اور اشتمالی انقلاب آجائے گا۔[14]

14 Karl Marx, *Das Capital* (USA: International Publishers,2010), vol 3, p: 628- 633.

اسپینگلر کا نظریہ تاریخ

اسپینگلر[15](Oswald Spengler:1880-1936) کی کتاب زوال مغرب (Decline of the West) سے اس کے افکار کا اندزاہ ہوتا ہے یہ کتاب اس نے جنگ عظیم اول کے دوران لکھی جو کہ ۱۹۱۸ء میں مکمل ہوئی۔ اس کتاب میں اسپینگلر نے تاریخ عالم کے اکثر گوشوں کو ایک فلسفی کی نظر سے دیکھا اس کتاب کے مطالعہ سے مصنف کی وسعتِ نظر، اخذ کردہ نتائج اور فکر انگیز مباحث کا اندازہ ہوتا ہے۔ اسپینگلر تاریخ عالم میں تمدن کو بنیادی حیثیت دیتا ہے۔ ان تمدنوں کو باقاعدہ شکل وار لانا سیاست کا کام ہے۔ اس کے مطابق سیاست اور تاریخ لازم ملزوم ہے اس نے تمدنوں کے حوالے سے تاریخ کی مختلف قسمیں کیں ہیں۔ نسلوں کی تاریخ، جنگی تاریخ، سیاسی تاریخ اور انسانی تاریخ جس میں مرد وزن کا کردار، نسلیں، خاندان، زبان، ریاست اور عوام سے متعلق تفصیلات دی ہیں۔

تہذیبیں

تہذیبیں وطن کے احصار میں جنم لیتی ہیں۔ سیاست، اقتصادیات، علوم وفنون اور مذہب اس کی ہئیت کو ترتیب دیتے ہیں۔ ہر تہذیب ملک کی سرحدوں تک محدود رہتی ہے اس لیے یہ دوسری تہذیبوں پر اثر انداز نہیں ہوتی بلکہ علیحدہ شناخت اور جدا مزاج رکھتی ہیں۔ اسپینگلر کہتا ہے کہ تہذیبیں ہجرت نہیں کرتیں ان کی اپنی روح ہوتی ہے جب یہ ختم ہوتیں ہیں تو ان کی روح کسی دوسری تہذیب میں منتقل نہیں ہوتی۔ البتہ ایک تہذیب دوسری تہذیب کو متاثر ضرور کرتی ہے۔ جس کا تعلق صرف تہذیب کے ظاہری جسم تک محدود ہوتا ہے۔ ہر تہذیب ایک خاص ماحول میں پیدا ہوتی ہے اسی میں پروان چڑھتی ہے اس لیے وہ مخصوص اور جداگانہ خصوصیات کی حامل ہوتی ہے۔ اسپینگلر تہذیبوں کی زندگی اور موت کا نظریہ پیش کرتے ہوئے کہتا ہے کہ تہذیبیں ارتقاء اور شباب کے بعد زوال پذیر ہو جاتی ہیں یہ اپنی مقررہ مدت گزارتیں ہیں اور فنا ہو جاتیں ہیں جس طرح ایک انسان موت سے بچ نہیں

---

15 اسوالڈ اسپینگلر جرمن کے ایک قصبہ بلکن برگ میں پیدا ہوا۔ اس نے ابتدائی تعلیم آبائی قصبہ میں حاصل کی اور اعلیٰ تعلیم کے لیے میونخ یونیورسٹی چلا گیا۔ علم کی مزید طلب کی وجہ سے وہ ہیلے اور برلن کی یونیورسٹیوں میں بھی گیا جہاں اس نے ریاضی اور نیچرل سائنس کے مضامین کو بطور خاص مطالعہ کیا اور اس میں خصوصی اعزازات حاصل کیے۔ اسپینگلر کی غور فکر کی عادت نے اسے تعلیم مکمل کرنے کے بعد بھی اسے فارغ نہیں رہنے دیا۔ اس نے عالمی تاریخ میں خصوصی دلچسپی لینی شروع کر دی۔ اسے تصنیف وتالیف سے گہرا شغف تھا۔ اس نے تین سال کی محنت شاقہ سے زوال مغرب لکھی۔ اس نے جرمن نوجوانوں میں نیا ولولہ، جوش اور عزم پیدا کیا اور پراگندہ جرمن ذہن قوم کی شیرازہ بندی اور ہٹلر نے انھیں سیاسی طور پر منظم کر کے ایک قوت بنا دیا۔
(Stephen M. Borthwick, *An Introduction to Oswald Spengler's Life and Works*.)

سکتا۔ اسپینگلر نے تہذیبوں کے عروج و زوال میں پیدائش، ارتقاء شباب اور موت کے درجے مقرر کیے ہیں۔ ۱۔ تہذیب کا ابتدائی دور، ۲۔ تہذیب کا موسم بہار، ۳۔ تہذیب کا موسم گرما، ۴۔ تہذیب کا موسم خزاں، ۵۔ تہذیب کا موسم سرما۔

تہذیبوں کے ادوار

تہذیب کے ابتدائی دور میں معاشرے کے افراد سادہ زندگی بسر کرتے ہیں مذہب سائنس اور آرٹ کا وجود نہیں ہوتا لوگ ایک دوسرے سے محبت اور بے لوث جذبہ خدمت رکھتے ہیں۔ اگرچہ اس دور میں تہذیب کا کوئی رنگ اور وجود نہیں ہوتا مگر یہ دور تہذیب کی پیدائش کے لیے مواد فراہم کرتا ہے۔ اسی کی بنیاد پر تہذیب دوسرے دور میں داخل ہونے کے لیے تیار ہو جاتی ہے۔ تہذیب کے دوسرے دور یعنی موسم بہار میں بہار کی طرح برگ و بہار نمودار ہوتیں نئی نئی کونپلیں نکلتی ہیں۔ معاشرے میں آرٹ مذہب اور سائنس کی سادہ انداز تشکیل ہوتی ہے۔ اس وقت زمین ذریعہ پیداوار ہوتا ہے ایک طبقہ پیداواری ذرائع پر قبضہ کر کے طاقت اور قوت حاصل کرتا ہے اور حکمران بن جاتا ہے۔ اس دور میں معیشت کا دارومدار زراعت پر ہوتا ہے۔ اس لیے آسائشیں تو ہوتیں ہیں مگر تکلف نہیں ہوتا۔ لوگ مذہبی رسومات کی پابندی کرتے ہیں۔ اس دور کے خاتمہ کی ابتداء اس وقت ہوتی ہے جب کاشتکار اور جاگیردار کا تصادم ہوتا ہے تو تہذیب دوسرے دور سے تیسرے دور میں داخل ہو جاتی ہے۔[16] اس دور کو تہذیب کا موسم گرما کا دور کہا جاتا ہے۔ تہذیب کے اس دور میں شہروں کی تعمیر ہوتی ہے قصبے شہر اور دیہاتوں سے لوگ ہجرت کر کے شہروں میں چلے جاتے ہیں۔ شہر ترقی کرتے ہیں صنعتیں قائم ہوتیں ہیں اور لوگ خوشحال زندگی بسر کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اب جاگیرداری کی جگہ امراء آجاتے ہیں وہ بھی ان کی طرح غریب کا استحصال کرتے ہیں۔ اور جب یہاں عوام اور امراء میں تصادم ہوتا ہے تو اس دور کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اب تہذیب موسم سرما میں داخل ہو جاتی ہے۔ اس دور میں تہذیب مادی نظریات کے زیر اثر ہوتی ہے ہر قدر کو مادی پیمانے سے ناپا جاتا ہے۔ اس وقت مادہ پرستی روحانیت کی جگہ لے لیتی ہے زوال اور فنا کا سامنا ہوتا ہے اور یہ تہذیب کا آخری دور ہوتا ہے۔

16 Oswald Spengler, *The Decline of the West* (London: George Allen), p: 196.

ٹائن بی کا نظریہ تاریخ

ٹائن بی[17] (Toynbee 1889-1976) کے نزدیک تاریخ کا مقصد تہذیب کو مذہبی، علاقائی اور سیاسی اوصاف کے ساتھ مطالعہ کرنا ہے۔ اس نے مطالعہ تاریخ واقعات سے نتائج کو اخذ کیا۔ اسباب و علل کو سامنے رکھ کر حالات اور واقعات کو پرکھا، اس لیے وہ مؤرخ کی نسبت فلسفہ تاریخ پر زیادہ زور دیتا ہے۔ اس نے تاریخ کا مطالعہ فلسفہ تاریخ اور عمرانیات کو سامنے رکھ کر کیا۔ مطالعہ تاریخ (A Study of History) میں تہذیبوں کی ابتداء، آفرینش، تنزّل، انتشار اور عمل تحلیل کے پہلوں کو سامنے رکھتا ہے۔

تہذیب کی ابتداء

ہر تہذیب ایک خاص دور میں پیدا ہوتی ہے پروان چڑھتی ہے اس کی زندگی کا دارومدار کچھ خاص عوامل پر ہوتا ہے۔ جب تہذیبوں سے تخلیقی صلاحیتیں ختم ہوتیں ہیں وہ تہذیب خود بخود ختم ہو جاتی ہے۔ ٹائن بی کے مطابق اب تک اکیس تہذیبیں پیدا ہوئیں جو ایک خاص مدت کے بعد ختم ہو گئیں۔ اب دنیا میں سات تہذیبیں اور کچھ نئی تہذیبیں ابھر رہی ہیں۔ مگر کچھ معاشرے آغاز سے ہی جامد اور ساکن ہوتے ہیں وہ ایک تہذیب کی شکل بننے سے پہلے ہی دم توڑ دیتے ہیں۔

ٹائن بی کہتا ہے تہذیبیں نسلی عوامل اور جغرافیائی ماحول کے مخصوص امتزاج سے بنتی ہیں۔ نسلی تخلیقی صلاحیتیں اور ماحول کا متوازن ہونا وہ عوامل ہیں جو تہذیبوں کو پروان چڑھاتیں ہیں۔ جغرافیائی اعتبار سے ماحول ایک ایسا چیلنج ہے جو اگر ناموافق ہو تو انسان دو صورتوں سے دوچار ہوتا ہے یا تو وہ ہجرت کر جائے یا جفاکشی کے ساتھ مردانہ وار مقابلہ کرے جب انسان کے اندر مقابلہ اور حوصلہ مندی اور جرأت کام کرتی ہے تو وہ زمین کے سینے کو چیر کر فصلیں اگاتی ہے دریاؤں کے آگے بند باندھ کر ان کو پابند بنا دیتا ہے۔ اسطرح ماحول پر قابو پا کر وہ معاشرے کو تہذیب کے مرحلے میں داخل کر دیتا ہے۔ شکست خوردہ قوموں میں جذبہ انتقام بہت زیادہ ہوتا ہے۔ وہ کسی نہ کسی طرح اس کھوج میں ہوتیں ہیں کہ کسی طرح بالادست قوم پر قابو پایا جائے۔ جب انہوں کو موقعہ ملا تو ان نے ایسی قوموں کو دبوچ لیا اور صفحہ ہستی سے ناپید کر دیا اور اسی عمل کے نتیجہ میں ایک نئی تہذیب ابھرتی ہے۔ جیسے موسیٰؑ کی قوم نے قبطیوں کا نہ صرف خاتمہ کیا بلکہ ایک نئی تہذیب کی بنیاد بھی رکھی۔ مذہب پرانی تہذیبوں کو ختم کر کے نئی

---

17 ٹائن بی لندن میں پیدا ہوا۔ آکسفورڈ یونیورسٹی میں تعلیم پائی لندن یونیورسٹی میں ۱۹۲۴ء تک پروفیسر رہے۔ ۱۹۲۵ء میں لندن سکول آف اکنامکس میں بین الاقوامی محقق کے طور پر مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۵ء میں ریٹائر ہوئے۔ اسپینگلر کی زوال مغرب جس نے ٹائن بی کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا۔ اب اس نے اس کے مقابلہ میں مطالعہ تاریخ لکھنے کا ارادہ کر لیا۔

تہذیب کا باعث بنتا ہے۔ ٹائن بی اس موقعہ پر اسلام کی مثال بھی دیتا ہے جو عیسائیت اور ہندومت کے خلاف تیزی سے پھیلا۔

خلاق اقلیت (Creative Minority)

معاشرے کو تہذیبی سطح پر چیلنجز کا سامنا رہتا ہے اور اس کے تخلیقی صلاحیت رکھنے والے لوگ اس کا جواب دیتے رہتے ہیں یہاں تک کہ معاشرہ تہذیبی سطح پر پہنچ جاتا ہے۔ معاشرے میں ترقی کا عمل اس وقت شروع ہوتا ہے جب حالات ناموافق، ماحول ناسازگار اور مشکلات کا سامنا ہو اس وقت افراد معاشرہ اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر مقابلہ کرتے ہیں۔ اور اگر اس وقت مقابلہ نہ سکے تو وہ اپنی ساخت کھو دیں گے۔ دوسری صورت میں اگر وہ مقابلہ کر جاتے تو تہذیبی سفر پر گامزن ہو جاتے ہیں۔ اس طرح ایک چیلنج کے بعد دوسرا اور تیسرا یہ عمل جاری رہتا ہے اور معاشرے اپنی بقا کے لئے ان کا جواب دیتے رہتے ہیں۔ یہ کام ابتدائے انسان سے ہی ہوتا آیا ہے ۔ حضرت آدمؑ کے لئے شیطان للکار بن گیا اور اسلام کو بھی مشرکین مکہ کے چیلنج کا مقابلہ کرنا پڑا اور مقابلہ کی اس ہمت نے آدمؑ کو بھی سرفراز کیا اور اسلام کو بھی اپنے تہذیبی سفر کی طرف بڑھا دیا۔

ٹائن بی اسپینگلر کی طرح تمدن کی حدود اور تہذیبوں کی روحوں کے مرنے کا قائل نہیں بلکہ وہ تہذیبوں کا ایک دوسرے سے رشتہ جوڑتا ہے تہذیبیں ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتیں ہیں۔ ٹائن بی کہتا ہے کہ تمدن انتہائی بلند سطح پر پہنچ کر ٹوٹ جاتا ہے اور ٹکڑے ٹکڑے ہونے کی صورت میں اس کی ترقی رک جاتی ہے۔ تہذیبیں اصل میں اندر سے ٹوٹتیں ہیں جب یہ للکار کا جواب نہیں دے سکتیں تخلیقی صلاحیتیں کمزور ہو جاتیں اکثریت کا اعتماد ان سے اٹھ جاتا ہے اور معاشرتی اتحاد فقدان کا شکار ہو جاتا ہے۔ تمدن دور زوال میں مسلسل سیاسی، سماجی اور معاشرتی تصادم کا شکار رہتا ہے۔ ریاستیں ایک دوسرے کے خلاف ہو جاتیں ہیں آخر کار تہذیب کی قوت مدافعت ختم ہو جاتی ہے تو وہ موت کا شکار ہو جاتی ہے۔ معاشرے اپنے قدیم طرز زندگی کی طرف مڑ جاتے ہیں پھر اگر کوئی تخلیقی قوت ان کو تازہ خون فراہم کرے تو وہ دوبارہ ایک نئے تمدن کے ساتھ ابھر سکتا ہے۔

ٹائن بی تمدن کی ترقی میں سب سے اہم خلاق اقلیت (Creative Minority) کو قرار دیتا ہے۔ اس سے مراد وہ تخلیقی صلاحیتوں والے افراد ہیں جو معاشروں کی رہنمائی کرتے ہیں اور انہیں بناتے ہیں جن کو انسان کامل یا عبقری کہا جا سکتا ہے۔ معاشرے کی رہنمائی سے پہلے وہ اپنی تکمیل کرتے ہیں گوشہ نشینی اختیار کرتے ہیں مسلسل عبادت اور ریاضت سے اپنی روحانی اور مادی شخصیت کی تکمیل کرنے کے بعد جلوت میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔ یہ لوگ معاشرے کو سنوارتے ہیں اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے ذہنی انقلاب برپا کرتے ہیں۔ معاشرے کی اکثریت ان کی تقلید

کرتی ہے یہ معاشرے کی ترتیب اور تنظیم کر کے اس میں جان اور قوت پیدا کر دیتے ہیں جس سے خوبصورت تمدن اور بہترین تہذیبیں معرض وجود میں آتیں ہیں۔[18]

ول ڈیوراں کا نظریہ تاریخ

"تمدن کی کہانی" ول ڈیوراں[19](Will Durant 1898-1981) کی گیارہ جلدوں پر محیط چار ہزار سال کی انسانی تہذیب و تمدن کے ارتقاء اور ترقی کی ایک دل فریب کہانی ہے۔ اس میں انسان کے کردار ذہن و شعور فکر و عمل اور اس کی متحرک عملی کوششوں کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ ہر طرح علمی اور ادبی ذوق رکھنے والے افراد مثلا ،شاعر ادیب فلسفی مؤرخ، مصور اور موسیقار کو شامل کیا گیا ہے۔ انسانی تہذیب کی اس کہانی کو بیان کرنے کے بعد خود ہی مصنف یہ سوال بھی اٹھاتا ہے کہ یہ جو تہذیب و تمدن کے مختلف پہلوؤں اور تجربات اور مشاہدات کا جو تاریخی ذخیرہ انسان کے پاس ہے یہ انسان کے مستقبل کے لیے افادیت کا حامل ہو سکتا ہے؟ کیا تاریخ آج کے سائنسی دور میں انسان کی منزل متعین کر سکتی ہے؟ اس پر مصنف خود ہی جواب دیتے ہوئے کہتا ہے۔

تاریخ اور ارضیات

تاریخ اور ارضیات کا رشتہ بہت قدیم ہے جب ان کے باہمی تعلق اور رفتار کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے ان دریاؤں پہاڑوں، صحراؤں، ریگستانوں میں رہتا ہوا انسان مسلسل جدوجہد اور سعی پیہم میں نظر آتا ہے۔ اس نے زمین کے سینے کو چیر کر گہرائیوں میں ذخائر کو تلاش کر لیا زمین کے چپہ چپہ کو مسخر کر لیا اور اپنی ضروریات زندگی کو پورا کرنے کے لیے اس زمین سے غلہ اور اجناس کو اگایا فطرت کے رازوں سے پردہ اٹھایا۔ اس کے اس عمل سے ایسے محسوس ہوتا ہے کہ جیسے وہ اس زمین کا مالک و مختار ہے۔ لیکن دوسری جانب انسان اپنی تمام صلاحیتوں، قوتوں اور ذہانت کے باوجود فطرت کے مقابلہ میں کمزور نظر آتا ہے۔ اس کی صدیوں کی محنت و مشقت سے تعمیر شدہ خوبصورت شہر، خوبصورت عمارتیں، وسیع و عریض و بلند و بالا محلات آنِ واحد میں ٹکڑے ٹکڑے ہو کر زمین کے برابر ہو جاتے ہیں۔ انسان کا فخر و غرور اور کاریگری خاک میں مل جاتا ہے۔ انسان فطرت کے مقابلے کمزور اور ناکام

---

18 آرنلڈ جے، ٹائن بی، مطالعہ تاریخ (مترجم غلام رسول مہر) (لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۰۷ء)، ص ۵۶۱۔۵۷۷۔

19 ول ڈیوراں امریکن مؤرخ ہیں۔ وہ نارتھ آدمز مساچیوسٹ میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم ایس ٹی پیٹر پراپرٹی سکول میں حاصل کی اس کے بعد سینٹ کالج نیو جرسی سے گریجویٹ کیا اور اعلیٰ تعلیم کولمبیا یونیورسٹی نیویارک سے حاصل کی۔ کچھ عرصہ صحافت پھر درس و تدریس کا پیشہ اختیار کیا ۱۹۲۷ء میں ملازمت ترک کر دی۔ اور "تمدن کی کہانی" ۱۱ جلدوں میں لکھی یہی ان کی وجہ شہرت تھی۔

Durant, Will (1935), *Our Oriental Heritage*., Simon & Schuster. p. vii.

ہے۔ فطرت اپنی رحمتوں سے انسان کے لیے خوشی اور بلاؤں سے انسان کو حراساں رکھتی ہے۔ آج بھی انسان کی جسمانی اور ذہنی ساخت کا دارومدار فطری حالات کے ساتھ ہے۔ اگر بارش کم ہو تو علاقے بنجر ہو کر ریگستان ہو جاتے ہیں اور تہذیبیں ختم ہو جاتیں ہیں اور زیادہ بارش سے تہذیبیں گنے جنگلوں میں روپوش ہو جاتیں ہیں۔

تاریخ اور جغرافیہ

تاریخ اور جغرافیہ کا باہم گہرا تعلق ہے۔ سمندر دریا چشمے تالاب، شہر و قصبے، ذرائع آمد و رفت ان سب کا تعلق جغرافیہ سے بھی ہے اور انسان کے ذہن فکر سے بھی۔ انسان مختلف جغرافیہ حدود میں قوموں اور نسلوں کی شکل میں رہتا ہے۔ اور اسی طرح یہی جغرافیائی ماحول جسمانی ساخت، رنگ، عادات و اطوار اور لباس کو بھی جدا کر دیتا ہے۔ ان مختلف جغرافیائی حالات کی وجہ سے انسان کا عمل مختلف ہوا ایجادات ہوئیں جس کی وجہ انسان ایک دوسرے کا محتاج ہوتا گیا۔ اسی طرح ان حالات نے تہذیب و تمدن پر گہرا اثر ڈالا دریاؤں کے قریب کی آبادیاں تہذیب و تمدن کا مرکز رہی ہیں۔[20]

تاریخ اور حیاتیات

حیاتیات کا مطالعہ تاریخ کو سمجھنے کے لئے بہت مددگار ثابت ہوتا ہے۔ یہ انسان کے عملِ ارتقاء کو بیان کرتا ہے۔ یہ انسان کی جدوجہد کشمکش، تصادم اور مقابلہ کی کہانی ہے۔ اس نے اپنے وجود کو برقرار رکھنے کے لیے جن مشکلات کا سامنا کیا وہ سارا طبعی ارتقاء حیاتیات کے مطالعہ سے ممکن ہے۔ وہ اپنی ضروریات کے لیے لڑتا جھگڑتا بھی رہا اپنے آرام و آرائش اور مفاد کی خاطر اپنے مقابل انسان کو ختم کرنے کی کوشش میں رہا۔ اپنی معاشی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے لوٹ مار اور جنگ جدل سے بھی باز نہ آیا۔ ول ڈیوراں کہتا ہے کہ انسان کے حیاتیاتی ارتقاء سے ہمیں یہ سبق بھی ملتا ہے کہ زندگی ہزار ہا جدوجہد اور مشقت کے بعد وجود میں آئی۔ جن لوگوں نے دنیا کے ان چیلنجز کا مقابلہ طاقت اور ہمت سے کیا وہ دنیا کی نعمتوں سے فیض یاب ہوتے ہیں جو لوگ ہمت ہار جاتے ہیں وہ حسرتیں اور محرومیاں لے کر اس دنیا سے گزر جاتے ہیں۔[21] فطرت اس بات کا بھی خیال رکھتی ہے جہد مسلسل اور تصادم کے نتیجے ذہین اور طاقت ور اشخاص ابھریں فطرت ان کا ہی انتخاب کرتی ہے۔ کمزور اور ناتواں لوگ موت کی آغوش میں چلے جاتے ہیں۔[22]

---

20 Will, Durant, *The Lessons of History*, p:14-17.

21 Ibid, p: 19.

22 Ibid, p: 21

فطرت غذائی ضروریات کے توازن کو بھی برقرار رکھتی ہے اس لیے قحط، وبا اور جنگ آبادی کو گھٹانے میں حصّہ لیتے ہیں۔ ول ڈیوراں کہتا ہے کہ یا پھر ہم برتھ کنٹرول کے ذریعے افراد اور غذا میں توازن پیدا کیا جائے۔

دنیا کی تاریخ میں مختلف رنگ و نسل کے افراد و معاشروں کی جدوجہد کے نتیجہ میں تہذیبی اور تخلیقی ارتقاء و ترقی سے یہ جذبہ پیدا ہوتا رہا کہ وہ دوسروں سے افضل ہیں ان کی تہذیب و تمدن دوسروں سے اعلیٰ ہے۔ اس پر بحث کرتے ہوئے ول ڈیوراں کہتا ہے کہ اس وقت دنیا میں بیس کھرب غیر سفید فام باشندے ہیں اور دس کھرب سفید فام افراد ہیں دنیا کی ہر قوم خود کو اور اپنی تہذیب کو دوسروں سے بہتر قرار دیتی ہے۔ جبکہ کہ تاریخ میں کوئی ارفع و اعلیٰ نہیں رنگ و نسل کا امتیاز کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ نسلیں تہذیبوں کو تخلیق نہیں کرتیں بلکہ تہذیبیں نسلوں کی تعمیر کرتیں ہیں اور کئی نسلیں باہمی میل جول سے نئی تہذیب و اقدار پیدا کرتیں ہیں۔ جب اس ملاپ سے قوم تشکیل پاتی ہے تو تہذیب و تمدن میں نئے پہلوؤں کا اضافہ ہوتا ہے کردار، اخلاق، ادب، ثقافت، فن، آرٹ اور مذہب سب کچھ بدل جاتا ہے۔[23]

تاریخ اور اجتماعیت

معاشروں میں عظیم اور ذہین افراد کا ظہور اچانک نہیں ہوتا۔ حالات و واقعات حادثات اور وجوہات جمع ہوتی رہتی ہیں اسباب بنتے رہتے ہیں۔ جب ماحول ساز گار ہوتا ہے تو اس وقت معاشرے کے ہیرو، شعلہ بیاں مقرر اور عظیم رہنماء ابھرتے ہیں اور اپنی صلاحیتوں سے تاریخی دھاروں کو بدل دیتے ہیں۔ نپولین، چرچل، مورس، فورڈ اور لینن یہ سب ہزارہا اسباب علل کے طور پر ظہور میں آئے۔ کوئی ایک آدمی زندگی میں اس قدر باصلاحیت، طاقتور نہیں ہو سکتا کہ تنہا تہذیب و تمدن میں انقلاب لا سکے۔ تہذیب کی نشوونما اور ترقی صدیوں بعد ہوتی ہے۔ اس میں کئی نسلیں اور افراد اپنی ذہانت، محنت و مشقت اور خون دیتی ہیں۔ کوئی بھی فردِ واحد اس کی تکمیل نہیں کر سکتا۔ اس لیے تہذیب و تمدن کی تکمیل انفرادی طور پر نہیں بلکہ اجتماعی طور پر ہوتی ہے۔[24]

تاریخ اور اخلاقیات

تاریخ کا مطالعہ ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ اخلاقی قوانین اٹل نہیں ہوتے ان کا مفہوم حالات کے ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ جب انسان وحشت اور بربریت کے دور میں تھا تو اسے اپنے وجود کو برقرار رکھنے کے لیے لڑنا مارنا اور چھین جھپٹ کرنا پڑتا تھا۔ اس لیے وہ عورتوں کے مقابلہ میں زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہتا تھا۔ وہ اس شکاری دور میں زیادہ

---

23 Will, Durant, *The Lessons of History*, p: 25

24 Ibid, p:34.

عورتیں رکھتا اولاد زیادہ پیدا کرتا تاکہ وہ اپنی طاقت اور قوت میں اضافہ کر سکے۔ لیکن جب وہ شکاری دور سے کاشتکاری دور میں آیا تو پرانی اقدار بدل گئیں اب اس کو محنت اور مشقت کرنا پڑی معاشی اور اقتصادی وسائل محدود ہو گئے اب برتھ کنٹرول دانشمندانہ عمل ٹھہرا۔ صنعتی انقلاب نے معاشرہ کا سماجی و اخلاقی ڈھانچہ بدل کر رکھ دیا مرد اور عورت میں مساوات قائم ہوئی عورت زندگی کے ہر میدان میں اس کے ساتھ پہلو بہ پہلو عمل پذیر ہوئی۔ اس مشینی دور نے انسان کی زندگی میں مزید پیچیدگیاں پیدا کر دیں جس سے معاشرہ کی اقدار اور روایات بدل گئیں۔ اولاد معاشی لحاظ سے دولت اور نعمت نہیں بلکہ مصیبت بن گئی۔ زندگی کی تلخیوں اور نئی تعلیم نے مذہب کی جڑیں اکھاڑ دیں۔ قدیم اخلاق، اقدار اور راویات ختم ہوئیں تاریخ کے ایک دور کی برائی دوسرے دور کی نیکی بن گئی۔[25]

تاریخ میں اخلاقی گراوٹ ہر دور میں رہی اور اس پر اسی طرح ہر دور میں احتجاج ہوتا رہا۔ عیاشی، جنسی بے راہ روی یہ ہمیشہ ہر معاشرہ میں رہی ہے۔ والیٹر نے تاریخ کو جرائم بے وقوفیوں اور آفتوں کا مجموعہ کہا ہے لیکن ان جرائم اور عیاشیوں کے پس منظر میں اکثیریت ان لوگوں کی رہی ہے جنہوں نے ایمانداری اور محنت مشقت سے زندگی گزاری ہے۔ موجودہ دور کی اخلاقی گراوٹ ہمارے معاشرے اور قوم کے لیے زوال کا باعث نہیں۔ ہمارا معاشرہ جب کاشتکاری دور سے صنعتی دور میں داخل ہوا تو اس نے قدیم روایات اور اقدار پر کاری ضرب لگائی۔ یہ اقدار جنہیں ہم نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں یہ عبوری دور سے گزر کر جب پختگی تک پہنچیں تو یہ معاشرے کے لیے قابل قبول ہو گئی۔ ابتدائی دور میں مذہب نے اخلاق پر کوئی اثر نہیں ڈالا، کیونکہ انسان نے ڈر اور خوف کی وجہ سے دیوتاؤں کو تخلیق کیا۔ اس کے لیے یہ سمندر پہاڑ درخت اور آسمان سب ناقابل فہم اور پر اسرار تھے۔ اس لیے اس نے ہر اس چیز کی پرستش شروع کر دی جو اس کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ فطری بلاؤں آسمانی آفتوں سے محفوظ رہنے کے لیے نذرانے قربانیاں اور دعائیں دیوتاؤں سے مانگی جاتی تھی۔ جب مذہب کے پجاریوں کی مستقل ایک جماعت بن گئی تو ان نے افراد کے اخلاق کو سنوارنے کے لیے دیوتاؤں کے خوف کا سہارا لیا۔ اس وقت سے مذہب اور اخلاق میں تعلق قائم ہوا۔[26] تاریخ کے اس طویل سفر میں جب ان نظاموں پر نظر ڈالی جائے جنہوں نے معاشروں کو منظم کیا امن امان کی پر سکون زندگی عطا کی۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ظلم و تشدد اور دہشت کے ذریعہ قابو پایا انہیں غربت

25 Will, Durant, The *Lessons of History*, p: 36.

26 Ibid, p:43.

و مفلسی کی زندگی گزارنے پر مجبور کیا گیا تو یہ نظام نظام بادشاہت تھا جو اپنی خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ برابر شریک رہا۔ جب ایک ذہن معاشرتی پیچیدگیوں کو حل نہ کر سکا تو جمہوریت کے نام پر مجموعی افراد کی رائے کو سامنے رکھ کر نظام حکومت قائم کیا گیا۔ لیکن پھر بھی پوری تاریخ انسانی میں لوگ ایک نقطہ نظر اور پالیسیوں پر متحد نہ ہو سکے ایک جماعت دوسری کے خلاف بغاوت کرتی رہی۔[27]

تہذیبوں کا زوال

تہذیبیں کیسے بڑھتی؟ پھیلتی ہیں اور پھر سمٹ کر تنگ ہو جاتیں ہیں اور آخر گھٹ کر مر جاتیں ہیں۔ ڈیوراں کے خیال میں اس تمام عمل میں کسی پر اسرار طاقت کا ہاتھ نہیں ہوتا بلکہ تہذیب کے خاتمہ کی وجہ سیاسی و معاشی اقدار کا زوال ہے جب رہنماء پیچیدہ مسائل کا جواب نہیں دے سکتے تہذیب جو حالات کے ساتھ بدلنا چاہتی ہے وہ ساکت ہو کر زوال پذیر ہو جاتی ہے۔ تہذیبیں مرتی نہیں بلکہ قومیں مر جاتی ہیں اور تہذیبیں زندہ رہتی ہیں۔ یونانی تہذیب اب تک انسانوں کے ذہنوں میں زندہ ہے اِس وقت فلاسفی شاعر اور سائنسدانوں کی کتب آج بھی لائبریریوں کی زینت ہیں۔ اُن کے افکار خیالات اور فلسفہ سے آج بھی لوگ فائدہ اٹھا رہے ہیں۔[28]

انسانی تہذیب اور دور حاضر

کیا ماضی نے اپنی شاندار روایات سے حال کو شکست دے دی ہے؟ حال اور ماضی میں کون فوقیت رکھتا ہے۔ اس کے جواب میں ول ڈیوراں کہتا ہے کہ حال نے انسانی تہذیب میں قابل قدر اضافہ کیا ہے۔ فنی اور سائنسی ترقی نے انسان کی مشکلات کو کم کیا ہے اس کی غذائی ضروریات کو پورا کیا ہے مشینوں کی ایجادات نے محنت اور مشقت میں کمی اور سکون اور آرام کے لمحات میسر کیے ہیں۔ یہ سب حال کے کارنامے ہیں۔ اس کے مقابلے میں ماضی بھی اپنے اندر گوہر نایاب لیے ہوئے ہے۔ آگ، پہیہ، شکار کے ہتھیار و آلات خاندان کی تنظیم، اخلاق و شرافت اور سخاوت کی قدروں کا فروغ، تہذیبی تجربات کی منتقلی یہ سب ماضی کی میراث ہے جو زمانہ حال کو ملی۔ موجودہ زمانہ کے انسان کو اس بات پر فخر ہے کہ اس نے تعلیم کے ذریعے کائنات کے سربستہ رازوں سے پردہ اٹھایا آج ایک معمولی پڑھا لکھا شخص اس کائنات کے بارے میں پوری پوری معلومات رکھتا ہے۔ ہماری تہذیب ماضی

---

27 Ibid, p:68.

28 Will, Durant, The *Lessons of History*, p: 93.

کے ورثہ کو محفوظ رکھے ہوئے ہے اور ہم خود بھی اس میں اضافہ کر رہے ہیں۔ موجود ترقی یافتہ تہذیب میں یونانی تہذیب کی دانشمندی اور حکمت موجود ہے۔ ہم آج بھی ان کے فلسفہ سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ اس لیے اس دور کی تہذیب کو محفوظ رکھنا اس میں اضافہ کرنا اور پھر اس کو آنے والی نسلوں کو منتقل کرنا ہماری ذمہ داری ہے۔[29]

کارلائل کا نظریہ تاریخ

کارل لائل[30] (Thomas Carlyle 1795-1881) رومانوی دور کا فلسفی ہے اسی دور میں پیدا ہوا جس میں جان کیٹس پیدا ہوا۔ کارل لائل کے کام سے رومانوی طرز کی کچھ مشترکہ چیزیں ملتی ہیں وہ اٹھارویں صدی کی عقلیت پسندی کا کھلا دشمن حقیقت پسندی اور نفس پرستی کی بھرپور مزاحمت کرتا ہے اور تمام ترجمالیاتی معاملات میں روایات کے خلاف رومانونیت کے ساتھ کھڑا نظر آتا ہے۔ وہ ایک فنکار کے تخلیقی عمل کو عقلی توجیحات کے ذریعے دبا دینے، روایت پسندی اور رومانویت میں انسانی سوچ کو ایک دائرہ میں محدود کر دینے کے خلاف ہے۔

کارل لائل کا تاریخ کے بارے میں تصور رومانویت کے عقیدہ کے تحت ہے، آئیڈیلزم کو پسند کرتا ہے، سوچ کی آزادی پر زور دیتا ہے اور معاشرے کی اجتماعیت کے خواب دیکھتا ہے۔ وہ شاعرانہ خیالات سے چمٹا ہوا فنون کو حقیقت مطلق کے اظہار کے طور پر دیکھتا ہے۔ کارل لائل تاریخ کو ایک الہامی منصوبہ تصور کرتا ہے جو خدا کی مرضی پر معمول اور انسان کی اپنی خود شناسی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ کارل لائل چونکہ جرمن فلسفہ و نظریات سے متاثر تھا انیسویں صدی کے شروع میں انگلش اور جرمن نظریات کا جو قدرتی امتزاج تھا جس کو ایک علیحدہ تاریخی گروہ (Historical School) کے طور پر جانا جاتا تھا۔ جس کے امتیازات میں انفرادیت پر زور دینا، تصور ترقی

---

29 Ibid, p: 95.

30 تھامس کارل لائل سکاٹ لینڈ کے شہر "ECCLEFECHAM" میں پیداء ہوئے۔ وہ مؤرخ فلاسفر اور ٹیچر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بہت بڑے ماہر عمرانیات جانے جاتے تھے۔ ان نے ابتدائی تعلیم اینا اکیڈمی میں حاصل کی اعلیٰ تعلیم اینڈن برگ یونیورسٹی سے حاصل کی، تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ ریاضی کے ٹیچر مقرر ہوئے۔ کارل لائل فلاسفر کے نظریات سے متاثر ہو کر انہوں نے جرمن نظریات کو پڑھنا شروع کیا ان کا انگریزی میں ترجمہ کیا، شیلے کی سوانح حیات لکھی۔ ۱۸۲۷ء میں وہ ایس ٹی اینڈریو یونیورسٹی میں اخلاقی فلسفہ کے شعبہ میں چیئر مین مقرر ہوئے۔ ۱۸۳۱ء میں وہ لندن چلے گے وہاں ان نے انقلاب فرانس کی داستان لکھی۔ کارل لائل کے لیکچرز کا مجموعہ (On Heroes ,Heroes Worship and the Heroic in History) ہے۔
Thomas Carlyle" (bio), Dumfries-and-Galloway, 2008.

پہلوں اور بعد میں آنے والے فطرت پسندوں سے علیحدہ تھا، ان کا طریقہ سائنسی نہیں تھا بلکہ وجدانی اور تشریحاتی تھا۔ کارل لائل کے کام میں یہ تمام خصوصیات پائی جاتی تھیں۔ اس نے انفرادیت پر زور دیا ہے۔ اس کا ارتقائی نظریہ اسی مکتبہ فکر سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کا کام کسی ایک اصول کا پابند نہیں۔ کارل لائل اس بات پر یقین رکھتا ہے ایک نیا روشن اور چمکدار دن تاریکیوں اور اندھیروں کے بعد ہی ملتا ہے۔ انسان کی مسلسل جد وجہد اس کے اندر کی تاریکیوں کو دور کرتی ہے اور روشنی پیدا کرتی ہے اور پھر وہ چمک اور روشنی لافانی ہوتی ہے۔ جیسا کہ کارل لائل کہتا ہے۔ انسان کے فانی جسم کے اندر ایک روح ہے جو کہ لافانی ہے۔

Under the mortal body lies a soul which is immortal.[31]

کارل لائل ایک مؤرخ کے طور پر زیادہ زور ہیروز پر دیتا ہے۔ وہ اس بات پر یقین رکھتا ہے ایک عظیم کام جو کہ ایک قوم کر سکتی ہے وہ عظیم انسان پیدا کرنا اور اس کی اطاعت کرنا ہے۔ تاریخ اصل میں عظیم انسانوں کے ساتھ منسوب ہے۔

Universal History, the history of what manhas accomplished in this world, is at bottom the History of the Great Men.[32]

وہ ہیروز کو عارفانہ اور صوفیانہ مقام دیتا ہے اور یہ رغبت دلانے کی کوشش کرتا ہے کہ پر جوش طریقے کے ساتھ ان کی اطاعت کی جائے ان کی تمام معاشرتی بیماریوں کا علاج عظیم لوگوں کی اطاعت میں ہے۔ ان کی اطاعت میں بے شمار فوائد اور انفرادی عظمت پنہاں ہے۔ اگر لفظ ہیرو کو "God" کے ساتھ منسوب کیا جائے تو "Hero-worship" ایک مذہب ہے۔

Great men are inspired (speaking and acting) Text of that divine books of revelation Where of a chapter is completed from epoch to epoch and by some by some named History.[33]

---

31 Thomas Carlyle, *Characteristics* (Boston: James R OSGOOD,1899), Vol. iii, p:37.

32 Thomas Carlyle, *On Heroes, Hero-Worship*, and the Heroic in History, p: 23.

33 Thomas Carlyle, *Sartor Resartus* (New Yark: C.F. Harold,1937), p: 177.

کارل لائل افراد کے مجموعی عمل کو تاریخ کا نام دیتا ہے۔ اس کے مطابق افراد کے مجموعی عمل سے معاشرہ کی اقدار عمل میں آتیں ہیں وہ مذہبی اور سیاسی پالیسوں کو صرف تاریخ کا نام نہیں دیتا ہے اور نہ ہی ان پر فلسفہ تاریخ کی بنیاد رکھتا ہے۔

کریسٹین کلیپشی کا نظریہ تاریخ (Christiane Klapisch)

کریسٹین کلیپشی ایک فرانسیسی مؤرخ ہے۔ اس نے یورپی عورتوں کی تاریخ "A History of Women in the west" لکھی۔ اس میں وہ سوال اٹھاتی ہیں کہ تاریخ صرف مردوں کی تاریخ ہے عورتوں نے تاریخ میں کوئی کردار ادا نہیں کیا۔ اس طرح وہ اپنی تحریک کا آغاز کرتی ہوئی کہتی ہے۔

Where have we come from? Where are we going?[34]

تاریخ میں عورتوں کو اس لیے شامل نہ کیا گیا کہ وہ نسوانی جسم رکھتی ہیں ان کو بدقسمت مظلوم اور اسے کم درجہ کی مخلوق کیوں سمجھا جاتا ہے۔ اور پھر وہ خود ہی اس کا جواب دیتی ہے کہ عورت پیدائشی طور پر بری مخلوق نہیں ہے بلکہ وہ تو دوسروں کی بنائی ہوئی دلدل میں پھنسی ہوئی ہے اسے مردوں نے برا اور کمزور بنا دیا ہے۔ کریسٹین نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ عورت نے مردانہ معاشروں میں اپنے وجود کو بہادری سے قائم رکھا ہے ۔ عورت کا کام صرف بچے پیدا کرنا ان کی پرورش کرنا اور معاشرے کو قابل افراد دینے کے بعد بھی وہ سوسائٹی میں ایک غیر معمولی مقام کیوں رکھتی ہے اس نے ہر مقام پر مرد کا ساتھ دیا ہے اور مرد سے بڑھ کر اپنی خدمات پیش کیں ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب عورت ہر موقعہ پر مرد کے ساتھ تھی تو پھر ان کے لیے علیحدہ درجہ بندی کیوں اور کیا تاریخ میں اقتصادی اور معاشی درجہ بندیوں کا خیال رکھا گیا اور عورتوں کو صرف اس لیے نظر انداز کر دیا گیا کہ وہ گھریلو زندگی اور بچے پیدا کرنے تک محدود ہیں۔ کریسٹین اس موجودہ سسٹم کو جاننے کی کوشش کرتی ہے کہ ابتداء میں یہ تقسیم کیسے وجود میں آئی اس کے مثبت اور منفی اثرات کیسے مرتب ہوئے۔ اور پھر وہ عورت کی زندگی کے مختلف اہم پہلوؤں کی طرف توجہ دیتی ہے کہ عورت کی زندگی میں شادی مذہب، ممتا یا تنہائی اہم ہیں۔[35]

---

34 Christiane Klapisch-Zuber, *A History of Women in the West* (London: Harvard University Press,1994), p: ix.

35 Christiane Klapisch, A *History of Women in the West*, p:2-8.

سفارشات

i. تاریخ اور فلسفہ تاریخ دو الگ الگ ہیں، تاریخ واقعات کا تسلسل ہے جبکہ فلسفہ تاریخ ان واقعات کے اسباب اور علل کو سامنے رکھتا ہے۔ لہذا ہمیں کسی بھی واقع کو ایسے ہی بغیر تحقیق کے قبول نہیں کر لینا چاہیے۔

ii. انسانی تہذیب میں بہت زیادہ شعبہ ہائے زندگی (سیاسی، معاشی، معاشرتی، تمدنی، وغیرہ) ہوتے ہیں ہر شعبہ ہائے زندگی تہذیب و تاریخ میں اپنی ایک اہمیت رکھتا ہے۔ ہمیں تاریخ کو سمجھنے کے لیے یا انسانی تہذیب کے اس مخصوص دور کے بارے میں جان کاری حاصل کرنے کے لیے ان تمام شعبہ ہائے زندگی کو دیکھنا ہو گا تو پھر ہمارے سامنے ایک واضع اور پوری تصویر آئے گی۔

iii. مطالعہ تاریخ کے حوالے سے ہمیں دیکھنا ہو گا کہ تاریخ نویس کس شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھتا ہے یا اس کی دلچسپی کا میدان کون سا ہے۔

iv. مطالعہ تاریخ میں فلسفہ تاریخ کو سامنے رکھنا بہت ضروری کیونکہ ماضی کو حال کے آئینے میں رکھا کر مستقبل کی تعمیر کی جاتی ہے۔ اس لیے ہمیں اپنی یاداشت کو سامنے رکھ اور محاسبہ کر کے کسی نئی بات تک پہنچنا ہے۔

خلاصہ بحث

انسانی تہذیب کے تمام تر واقعات جو ہم تک پہنچے ہیں وہ تاریخ کے ذریعے ہی پہنچے ہیں مؤرخین نے اپنی اپنی دلچسپی کے مطابق ان واقعات کو قلم بند کر کے اگلی نسلی تک پہنچایا ہے۔ انسانی تہذیبی روایت میں صرف ایک پہلو نہیں ہوتا بلکہ کوئی بھی تہذیب ہو اس میں انسان کے متعلق بہت سے شعبہ ہائے زندگی ہوتے ہیں۔ انسانی تہذیب مختلف شعبہ ہائے زندگی کا مجموعہ ہوتی ہے۔ اور پھر انسانی تہذیب میں جتنے بھی واقعات رونما ہوتے آئے ہیں ان کے اسباب ایک یا ایک سے زیادہ بھی ہو سکتے ہیں۔ فلسفہ تاریخ کا مقصد بھی یہی تلاش کرنا ہوتا ہے کسی بھی امر واقع کے اسباب اور علل کیا ہیں۔ جدید دور کے مؤرخین نے ان کو سامنے رکھتے ہوئے اپنی اپنی تحقیقات پیش کی ہیں۔ ہیگل تاریخ کی درجہ بندی کر کے اس کو مختلف پہلوؤں سے دیکھتا ہے، تاریخ کو جدلیتی اسلوب میں پرکھ کر بیان کرنے کا قائل ہے۔ کارل مارکس تاریخ کو مادی افادیت، طبقات اور استحصال کے تناظر میں دیکھتا ہے۔ اسپنگلر تہذیب کو مختلف ادوار میں تقسیم کرتا ہے کہ تہذیبوں کی ابتداء کسی طرح ہوتی ہے اور پھر نقطہ عروج اور زوال تک کسی طرح پہنچتی ہیں۔ ٹائن بی کے

ہاں تہذیب کا بنیادی نقطہ تخلیقی صلاحیتوں کا ہونا ہے جب تک تخلیقی صلاحیتیں اور خلّاق اقلیتیں معاشرے میں موجود رہتی ہیں تو وہ پیدا ہونے والی تحدیات کا جواب دیتی رہتی ہیں جب وہ ختم ہوتی ہیں تو تہذیبیں زوال کا شکار ہو جاتی ہیں۔ ول ڈیوران تاریخ کو انسانی کوششوں اور اس کے فکری ارتقاء کے ساتھ دیکھتا ہے، انسان نے اپنے دائرہ حیات کے تمام پہلوؤں میں جو ارتقاء پیدا کیا اور مستقبل کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے لیے سہولتیں پیدا کیں، یہ ماحول اس کی جدجہد کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ کارلائل شخصیت پرستی کا قائل ہے وہ کہتا ہے کہ قوموں کا کام انسان پیدا کرنا ہے اور ان کی اطاعت کرنا ہے، تاریخ اصل میں عظیم انسانوں کے ساتھ منسوب ہے۔ کریسٹین کلیپشی کہتی ہے کہ پوری انسانی جدوجہد میں مرد اکیلا نہیں تھا اس کے ساتھ عورت ہر موقع پر موجود رہی ہے اس نے اس کا ساتھ دیا ہے اور تاریخ میں عورت کو فراموش کیوں کیا جاتا ہے۔